

# جہنم ارسی

## پرویز صاحب کا ایک درس قرآن

★★★★★

پرویز صاحب کا ہفتہ واری درس قرآن مجید ہمارے دور کے نوادرات میں سے ہے۔ اس سے قرآن کی عظمت اس طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ انسان بلا ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ لاریب یہ خدا کا کلام ہے۔ انہوں نے ان درسوں کا سلسلہ ۱۹۵۳ء میں کراچی میں شروع کیا۔ وہ درس مختلف موضوعات پر ہوتے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں وہ لاہور منتقل ہو کر آگئے تو انہوں نے قرآن مجید کا مسلسل درس شروع کیا۔ ۱۹۶۸ء میں ان کا پہلا دور ختم ہوا تو بار دیگر ان کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ آج کل سورہ السباء (۳۲) بائیسواں پارہ زیر تدریس ہے۔ یعنی بارہ سال کے عرصہ میں ہم بائیسویں پارہ تک پہنچ پائے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ درس کس قدر مفصل اور شرح ہوتے ہیں۔ یہ درس (TAPES) میں ریکارڈ کر دیئے جاتے ہیں اور انہی کے ذریعے درس کا سلسلہ اندرون اور بیرون پاکستان متعدد مقامات پر مسلسل جاری ہے۔ نیز پرویز صاحب کے ایک قدیمی رفیق، ملک ظہور احمد صاحب انہیں بتدیج ضبط تحریر میں بھی لارہے ہیں۔ فجزاک اللہ احسن الجزاء۔

یوں تو ان کا ہر درس منفرد ہوتا ہے سین ۲۸ مارچ کو جو موضوع زیر تدریس آیا وہ اس قدر اہم تھا کہ درس کے بعد اکثر قارئین نے کہا کہ اسے کسی طرح طلوع اسلام میں بھی شائع کر دیا جائے تاکہ جن لوگوں تک یہ بذریعہ ٹیپس نہ پہنچ سکے وہ بھی اس سے استفادہ کر سکیں، کسی خطاب یا درس کا ضبط تحریر میں لانا مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور اگر اسے کسی طرح منضبط کر بھی لیا جائے تو تحریر میں تقریب کی سی بات پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور پھر تقریب بھی پرویز صاحب کی؛ بایں ہمہ کوشش کی گئی ہے کہ درس کا اور یجنل انداز نہیں تو کم از کم اس کا مفہوم سامنے آجائے۔ جن احباب کے پاس کیسٹ ریکارڈ ہوں، اور وہ چاہیں تو انہیں ان درسوں کے کیسٹ قیمتاً چھتیا کئے جاسکتے ہیں۔ اس تمہید کے بعد آپ درس ملاحظہ فرمائیے :-

## درس قرآن مجید

عزیزان گرامی قدر!  
سلام و رحمت۔

آج مارچ ۱۹۸۰ء کی ۲۸ تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورہ السباء کی آیت ۳۲ سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں نے سابقہ



درس کے آخر میں کہا تھا اس آیت میں ایک بڑا اہم موضوع ہمارے سامنے آتا ہے — یہ موضوع ہے جہنم میں بیٹروں اور عوام کی باہمی گفتگو، آقاؤں اور غلاموں کے مکالمات، مذہبی راہنماؤں اور ان کے معتقدین کی بحث و تھویص بلکہ طعن و تشنیع۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس موضوع تک پہنچوں خود جہنم کے متعلق ایک تمہیدی تعارف ضروری ہے۔ آخرت کی زندگی اور وہاں کی جنت اور جہنم اور دیگر کوائف جو قرآن کریم میں مذکور ہیں ان پر ہمارا ایمان ہے۔ آخر دی زندگی پر ایمان کے بغیر تو کوئی شخص مسلمان ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ تو خود خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا لایتنفک مرحلہ ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے جنت اور جہنم کی تمہید اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے۔ جنتِ ارضی کے متعلق تو کسی بعد کے درس میں ذکر آئے گا۔ آج کے درس میں گفتگو اس دنیا کے جہنم سے متعلق ہوگی۔ ہمارے ہاں اس دنیا کے جہنم اور اس کے عذاب کے متعلق کبھی گفتگو نہیں ہوتی۔ سارے وعظ اور نصائح۔ تمام تنذیر و ترمہیب، آخر دی جہنم سے متعلق ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اقل تو ان تنذیرات کا کچھ اثر نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو وقتی اور ہنگامی۔ اس لئے کہ ایوں سمجھے کہ) انسان کی کچھ "فطرت" ایسی واقع ہوئی ہے کہ جو مصیبت یا آفت دیر میں آنے والی ہو، اس کا احساس زیادہ اثر انگیز نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں اس قسم کے خیالات عام ہیں کہ — مٹس از بلائے کہ شب درمیاں — بلکہ یوں کہ اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

سلیم پاتی پتی (مرحوم) نے تو اسی خیال کو زیادہ شوخ اور طرار انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ وہ تصور و حور، بجا۔ بجا۔ یہ شباب و حسن غلط، غلط مگر اس کا کوئی جواب دے، کہ یہ نقد ہے وہ اُدھار ہے جس طرح انسان نقد کی طرف تیزی سے لپکتا ہے اسی طرح وہ سامنے کھڑی مصیبت سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (انسان عجلت پسند واقع ہوا ہے)، تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔ قانونِ مکافاتِ عمل کی نتیجہ خیزی کے سلسلے میں یہ طریق زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے کہ اس دنیا کے جہنم کے شعلوں کو سامنے لایا جائے۔ سورہ عنکبوت میں ہے کہ يَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ اے رسول یہ تم سے کہتے ہیں کہ جس عذاب کی تم دھمکیاں دیتے رہتے ہو، اسے جلدی سے لا کر دکھاؤ۔ جس جہنم سے تم ڈراتے رہتے ہو وہ جہنم ہے کہاں ان سے کہو: وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَفَرِ (پہلے) وہ جہنم تو تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اگر وہ تمہیں نظر نہ آئے، یا یوں کہئے کہ اگر تم اسے دیکھنا ہی نہ چاہو، اپنی آنکھیں بند رکھو تو اس جہنم کو تمہیں کس طرح دکھایا جائے؟

خضر کیونکہ بتائے کیا بتائے؟ اگر ماہی کے دریا کہاں ہے لیکن اگر تم اسے نہیں دیکھتے: وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ (پہلے) تو تم جہنم کی نگاہوں سے اور جہل نہیں ہو۔ وہ تو تمہیں ہر لمحہ اور ہر آن دیکھ رہا ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو اپنے مخصوص دلنشین انداز میں متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں

سخن ز نامہ و میراں دراز تر گفتی ہزار حیف نہ بینی قیامت موجود!

صرف جہنم ہی نہیں بلکہ پوری کی پوری قیامت جس میں ہر انسان کے ہر سانس میں اعمال ٹپکتے رہتے ہیں۔ دوسرے مقام پر وہ اسی خیال کو زیادہ شگفتہ پیرائے میں (بلکہ یوں کہئے کہ شہزادہ انداز سے) بیان کرتے ہیں جب کہتے ہیں:



نہ دوزخ واعظ کا فرگرے گفت حدیثے خوش تر از فرے کافرے گفت  
”نہ داند آن عظام، احوال خود را کہ دوزخ نامقام دیگرے گفت“

واعظ، جس کا مشغلہ ہی کافرگری ہوتا ہے، ایک دن دوزخ کے متعلق بڑی لمبی چوڑی داستانیں بیان کر رہا اور لوگوں کو اس کے عذاب سے ڈرا رہا تھا۔ وہیں کہیں ایک کونے میں ایک کافر کھڑا تھا۔ وہ اس واعظ کی باتیں سن کر مسکرایا اور کہنے لگا کہ یہ غلام اپنے احوال سے کس قدر بے خبر ہے جو دوزخ کو دوسرے لوگوں کا مقام بتا رہا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ خود دوزخ کے اندر کھڑا ہے۔ (اس میں ”غلام“ کے لفظ میں ساری حقیقت سمٹ کر آگئی ہے)

لیکن اسے معلوم کس طرح سے ہو؟ اسے جہنم کا عذاب دکھائی کس طرح سے دے؟ وہ تو اسے دکھائی دیتا ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے: **وَبَدْرُتُ الْجَحِيمُ لِمَنْ يَدْرِي دِرْ** (دیکھنے والے کے لئے جہنم ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ دیکھنے والے جس عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔ ان کے لئے اس میں نہ موت ہوتی ہے نہ زندگی: **ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰى**) چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دیتی ہے لیکن ان کی بدبختی کہ وہ مر بھی نہیں سکتے: **وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُمْ بِمُعْذِرِينَ** (پڑا) غالب نے شاید ایسی ہی کیفیت میں کہا تھا کہ۔

مرتاہوں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

وہ شدت اضطراب سے ہزار بار چاہیں گے کہ اس جہنم سے کسی طرح نکل جائیں لیکن وہ اس سے نکل نہیں سکیں گے! **كُلَّمَا أَمَّا أَدْوَا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غِيَةِ أَعْيُنِهِمْ وَإِنْ فِيهَا دِرْ**۔ فرط غم و اندوہ سے تنگ آکر وہ ہزار بار ارادہ کریں گے کہ وہاں سے نکل جائیں لیکن وہ نکل نہیں سکیں گے۔ وہ جب بھی نکلنے کی کوشش کریں گے انہیں دھکے دے کر اس میں واپس دھکیل دیا جائے گا۔ یہ اس لئے کہ یہ جہنم تو قوم یا معاشرہ کی اجتماعی بد اعمالیوں کا دبکایا ہوا ہوتا ہے۔ ایک فرد کی انفرادی کوشش اس سے نکلنے میں کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے؟ جہنم میں تو ان لوگوں کے گرد وہ داخل ہوتے ہیں: **وَسَيُتْلَىٰ ذِكْرُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ ذُرْ** (پڑا)۔ اس میں قومیں داخل ہوتی ہیں (پڑا)۔ اس لئے جب پوری کی پوری قوم جہنم میں ہو تو قوم کے افراد اس عذاب سے کس طرح بچ سکیں گے؟ نہ ہی یہ صورت ہوگی کہ جہنم کے اندر کوئی گوشہ جنت کا ہو جہاں یہ افراد سمٹ کر بیٹھ جائیں!

اب سوال یہ ہے کہ یہ جہنم ہے کیا اور اس کے عذاب سے مفہوم کیا ہے؟ جہنم عبرانی زبان کا لفظ ہے اور دو نفلوں سے مرکب — جی اور ہنوم — جی کے معنی دادی ہیں اور ہنوم کس آدمی کا نام تھا۔ دادی ہنوم یروشلم کے جنوب میں ایک مشہور وادی تھی جس میں زمانہ قدیم میں مولوک دیوتا کے حضور انسانوں کو ذبح کر کے اور ان کی لاشوں کو جلا کر قربانی پیش کی جاتی تھی۔ لہذا، جہنم سے مراد ہے وہ قربان گاہ جہاں انسانیت کو ذبح کیا جائے اور مکرم و شرف آدمیت کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا جائے۔ اس دیوتا کے لئے ”مولوک“ کا لفظ بھی بڑا معنی خیز ہے۔ یعنی وہ جسے دوسرے انسانوں پر حق ملکیت حاصل ہو۔ وہ مالک (MASTER)۔ صاحب اقتدار ہو اور دوسرے انسان اس کی ملک اس کے تابع فرمان۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ قرآن کریم نے جہنم کے داروغے کا



نام بھی مالک بتایا ہے۔ سورہ زخرف میں ہے: **وَنَادُوا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَجُلًا**۔ وہ آواز دیں گے کہ اے مالک! اپنے رب سے کہو کہ وہ ہمارا قصہ تمام کر دے۔ اس مسلسل عذاب سے موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ وہ کہے گا: **قَالَ اَتَاكُمْ مَّيْمُونٌ** (پہلے)۔ یہاں تم مر نہیں سکتے۔ تمہیں اسی عذاب میں مبتلا رہنا ہوگا۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے ایک لفظ میں پورے کے پورے جہنم کا نقشہ کس طرح مرکوز کر کے رکھ دیا ہے۔ یعنی جس معاشرے میں کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو دوسرے انسانوں پر کسی قسم کا اقتدار حاصل ہو وہ معاشرہ جہنمی ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے بنیادی طور پر اعلان کر دیا ہے کہ **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ** (پہلے)۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ لہذا، جس معاشرہ میں تکریم انسانیت پر کسی قسم کا بھی حرف آتا ہو۔ جس معاشرہ میں کسی فرد کو بھی ذلیل کیا جائے یا وہ اپنے آپ کو ذلیل محسوس کرے۔ وہ معاشرہ جہنمی ہے۔ جہنمی معاشرہ وہ ہے جس میں نہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم ہو اور نہ ہی محتاج۔ یہی دین کی غایت اور اسلام کا مقصود ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں جہنمی معاشرہ وہ ہے جس میں بر ملا کہا جاسکے کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست  
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

کسی انسان کا دوسرے انسانوں کا محکوم یا دست نگر ہونا وجہ تذلیل انسانیت ہے۔ قرآن کریم نے **الْحَيَاةِ الدُّنْيَا** (پہلے)۔ یعنی ذلت و خواری کو عذاب النار سے تعبیر کیا ہے (پہلے)۔ جس معاشرے میں کسی ایک ابن آدم کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے اس معاشرہ سے خدا روٹھ جاتا ہے اور اسے ہلاکوؤں اور چنگیزوں کے سپرد کر دیتا ہے کہ جاؤ اور اس پورے قوم کو ذلت و خواری کے جہنم میں جھونک دو۔ خدا کا بسیرا اس معاشرہ میں ہوتا ہے جہاں کے گورنر سے ایک دفعہ ایک ذمی کے لئے نادانستہ زبان سے نکل گیا: **اَحْزَنَكَ اللّٰهُ**۔ خدا تجھے ذلیل کرے۔ بعد میں جب اس غلطی کا احساس ہوا تو باپ خلافت فاروقی میں جھکے ہوئے سر اور پرہیزگار آنکھوں سے اپنا استغفیٰ پیش کر دیا۔ گورنر بڑا پاکیزہ اور نہایت قابل اور پیرا عماد تھا۔ رفقاء نے ہزار سمجھایا کہ سہواً تمہاری زبان سے ایک لفظ نکل گیا ہے۔ تمہاری تلامذت کے آنسوؤں نے اس داغ کو دھو کر صاف کر دیا ہے۔ تم اپنا استغفیٰ واپس لے لو۔ لیکن اس نے ایک بھی مان کر نہ دی اور کہا کہ کوئی چھوٹا موٹا جرم ہوتا تو میں اپنے دل کو تسلی بھی دے لیتا کہ اشک تلامذت اس کی تلافی کر دیں گے۔ لیکن تذلیل انسانیت ایسا سنگین جرم ہے جس کی میرے نزدیک تلافی ہو نہیں سکتی۔

خدا کا مسکن ایسا ہی معاشرہ ہوتا ہے۔ اسی کو جہنمی معاشرہ کہتے ہیں جس کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ **وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهُهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذُلٌّ** (پہلے)۔ اس میں کوئی شخص روسیہ نہیں ہوگا۔ کسی کو ذلت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جائے گا۔ اس کے برعکس جہنم ہے: **وَيَخْلُدُ فِيْهِمُ مُّہَانًا** (پہلے) اس معاشرہ میں انسانوں کی توہین ہوگی۔ انسانیت کی تذلیل ہوگی۔ "تذلیل و تحقیر" میں ہر قسم کا عذاب آگیا۔



قرآن مجید میں جہنم کے لئے جحیم کا لفظ بھی آیا ہے جحیم کے معنی ہیں وہ مقام جہاں آگ کوئی ٹک جائے۔ آگ نہ بڑھ سکے۔ قرآن مجید کی رو سے انسانی زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی اور اوپر کو ابھرتی چلی آرہی ہے



وہ اولیں جبرئیلہ حیات سے مختلف منازل طے کرتی پیکر انسانیت تک پہنچی ہے۔ جن انواع میں زندہ رہتے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی وہ آگے بڑھ گئیں جس نوع میں یہ صلاحیت نہ رہی وہ وہیں رک گئی۔ انسانوں کی اس دنیا کی زندگی اس کا روانہ حیات کی آخری منزل نہیں۔ اسے آگے بڑھنا اور زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنا ہے۔ یہ سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری ہے گا موجودہ سطح زندگی پر اس کا طریقہ یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مستخرج کر کے انہیں مستقل اقدار خداوندی کے مطابق عالمگیر انسانیت کی منفعت کے لئے عام کر دیا جائے۔ اس سے اس کی دنیا کی زندگی بھی جنت آشنا ہو جائے گی اور آخر وہی زندگی بھی فردوس بدایاں۔ ظاہر ہے کہ ایسا کچھ اجتماعی نظام کی رو سے ہی ہو سکے گا۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مصائب زندگی میں صاحب اختیار بنایا ہے کہ جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے اور جو چاہے پیچھے رہ جائے۔ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَأَخَّرَ (پہلے) فطرت کی قوتوں کو مستخرج کرنے کے لئے کافر اور مؤمن دونوں کے لئے میدان کھلا ہے۔ کافران قوتوں کو اسی دنیا کی خوشگوار یوں کے حصول کے لئے صرف کرتا ہے کیونکہ وہ آخر وہی زندگی پر ایمان ہی نہیں رکھتا۔ لیکن مؤمن انہیں اقدار خداوندی کے مطابق صرف کرتا ہے تو اس کی دنیاوی زندگی بھی حسین اور خوشگوار ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی ذات نشوونما پاکر اگلی زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے ان کے متعلق کہا: قَالُوا لَوْلَا لِهٰمْ حِزْبًا لِّمَنْ عَمِلُوا۔ انہیں ان کے حسن عمل کا دوسرا صلہ ملے گا: وَهُمْ فِي الْخُرُوفِ اٰمِنُونَ (پہلے)۔ لفظ غرقاں بڑا ہی جامع ہے۔ اس میں خوشگوار یوں کی کثرت، رضا کی تیزی اور مدارج کی بلندی سب شامل ہیں۔ اور آئینوں کے اضافہ سے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ ہر قسم کے خوف و خطر سے مأمون ہوں گے۔ قرآن کریم نے جماعت مؤمنین کی ارضی جنت کا نقشہ انہی الفاظ میں کھینچا ہے: اَنْهٰی السَّابِقُونَ السَّابِقُونَ کہہ کر پکارا ہے (پہلے) یعنی سب سے آگے بڑھ جانے والے۔ آگے بڑھ جانے والے بھی اور (اعلون) بلند تر بھی۔

مومن بالائے ہر بالا ترے غیرت اور برتاؤ ہمسرے

ان کے برعکس جو قوم مصائب حیات میں پیچھے رہ جائے ان کی زندگی جہنم (جہنم) کی ہوتی ہے، لَا حِزْبَ لَہُمْ اَللّٰہُ ذَا اَنْہُمْ مُّقْرَّبُونَ (پہلے)۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ لوگ اہل جہنم ہیں کیونکہ یہ دوسروں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

زندگی جوئے روان است و رواں خواب ماند  
ایں مے کنہ جوان است، و جوان خواب ماند

زندگی کی مثال ایک ندی کی سی ہے۔ ندی اس وقت تک ندی کہلاتی ہے جب تک اس کے پانی میں روانی رہے۔ جب اس کا پانی کسی جگہ رک جائے تو وہ ندی نہیں رہتی، جو ٹہر بن جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس پانی میں مٹر اند اور تھن پیدا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اس کا وہی پانی جو مدحیات تھا، مہلک ہو جاتا ہے۔

جو قوم زندگی کی شاہراہ پر رک کر کھڑی ہو جائے اس کی یہی حالت ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی جہنم کی ہوتی ہے۔ اور جس کی اس دنیا کی زندگی جہنم کی ہو اس کی آخر وہی زندگی بھی جہنم کی ہوتی ہے۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا  
جو آج جگر سوز و خود افرور نہیں ہے

وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ و نرا  
جس قوم کی تفتدیر میں امروز نہیں ہے



اور یہی ہے وہ جہنم جس میں لیڈروں میں اور عوام میں - غلاموں میں اور ان کے آقاؤں میں - مذہبی راہ نمائوں اور ان کے متبعین میں وہ مکالمات ہوتے ہیں جن کے تذکرے سے میں نے اس درس کا آغاز کیا ہے جیسا کہ میں پہلے بھی کئی بار واضح کر چکا ہوں قرآن کریم جنت اور جہنم (اور آخروی زندگی کی دیگر کیفیات) کو مثالی انداز میں بیان کیا ہے۔ مثالی انداز میں الفاظ کے معنی (LITERAL) نہیں لئے جاتے بلکہ ان کا مجازی مفہوم لیا جاتا ہے۔ ان مکالمات سے یہ واضح ہے کہ اس عذاب کا ذمہ دار کون ہوتا ہے جو کسی قوم پر مسلط ہو جاتا ہے۔

## مکالمات

ان مکالمات میں قرآن کریم نے جن دو گروہوں کو ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا کیا ہے ان میں سے ایک گروہ "مستکبرین" کہہ کر پکارا گیا ہے اور دوسرے کو "مستضعفین" یہ اصطلاحات بڑی جامع ہیں۔ سمجھنے کے لئے مستکبرین وہ لوگ ہوں گے جنہیں دوسروں پر کسی قسم کا اقتدار اور بالادستی حاصل ہو۔ اور مستضعفین وہ لوگ جنہیں کمزور بنا دیا گیا ہو اور وہ بالادست طبقہ کے مطیع و فرمان بردار ہوں۔ بالادست طبقے میں قوم کے لیڈر، مذہبی راہنما، اور ارباب اقتدار سب شامل ہیں اور مستضعفین کا طبقہ عوام پر مشتمل۔ مکالمات کی ابتداء سورہ السبا کی آیت اکتیس سے یوں ہوتی ہے:

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ لَلَّكُمَا مُؤْمِنِينَ (۳۴)

تم ذرا چشمِ تصور کو کام میں لا کر اُس منظر کو دیکھو جب یہ ظالمین خدا کے حضور کھڑے ہوں گے اور آپس میں جھگڑا رہے اور اپنی سوزناک تباہی کا التزام ایک دوسرے پر دھر رہے ہوں گے۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور اس دعوتِ حق و صداقت کو قبول کر لیتے۔ اس کے جواب میں :-

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا . . . . . مُجْرِمِينَ (۳۵)

ان کے لیڈران سے کہیں گے کہ ہمیں کیوں مطعون کرتے ہو؟ جب سیدھا راستہ تمہارے سامنے آگیا تھا تو کیا ہم نے تمہیں روکا تھا کہ اس راستے کو اختیار نہ کرنا۔ تم خود ہی جرائم کا ارتکاب کرنا چاہتے تھے۔

اب خواہ مخواہ التزام ہم پر دھرا رہے ہو؟

فطرِ نطاس پر یہ جواب معقول دکھائی دیتا ہے لیکن :-

وَقَالَ الَّذِينَ اسْتَضَعُّوْا . . . . . نَجْعَلْ لَّهٗ اٰنْدَادًا (۳۶)

اس پر عوام ان سے کہیں گے کہ تم کیا کہہ رہے ہو کہ تم نے ہمیں اس سے نہیں روکا تھا اور ہم نے خود ہی اس سے انکار کیا تھا؟ تم رات دن اس قسم کی چالیں چلتے اور قریب کاریاں کرتے رہتے تھے جن سے ہم اس صحیح راستے کے قریب تک نہ پھٹک سکیں۔ تم اس قسم کے احکام صادر کرتے اور قوانین نافذ کرتے رہتے تھے جن سے ہم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے بجائے تمہاری اطاعت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ ہمارے لئے اس کے سوا چارہ کار ہی نہیں تھا۔ کیا اس کے بعد بھی تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم نے ہمیں اس راستے کی طرف آنے سے نہیں روکا تھا؟



دوسرے مقام پر اس بالا دست طبقے کی سازشوں کو بڑے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فرمایا: وَلِصَغَىٰ إِلَيْهِ أَفِيدَةُ  
الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ۔ ان کی ان ساری کارستانیوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ عوام کسی نہ کسی طرح ان کے ساتھ ہیں  
انہیں اپنے ساتھ رکھنے کا مؤثر ترین طریق یہ تھا کہ جس روش پر چلنے سے وہ خوش ہوں انہیں اسی روش پر چلنے دیا  
جائے (وَلِيُضْمِرُوا)۔ اس روش کی جائزیتوں اور دلکشیوں میں اور اضافہ کر دیا جائے: وَلِيُقَاتِرُوا مَا هُمْ مُقَاتِرُونَ  
(سورہ)۔ وہ لوگ جائز و ناجائز جس جس طریق سے بھی دولت کماتے تھے انہیں ایسا کرنے دیا جائے تاکہ وہ ان بڑوں کی  
اس قسم کی حرکات پر انہیں ٹوک نہ سکیں۔ یعنی ان بڑوں کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ سارا معاشرہ ان ہی کے رنگ  
میں رنگا جائے۔ عوام کی اصلاح کئے بجائے انہیں ان کی غلط روی میں اور پختہ کر دیا جائے۔  
میں نے پہلے کہا ہے کہ ان بڑوں میں ارباب اقتدار کے علاوہ مذہبی راہنما بھی شامل تھے۔ اس کی تصریح دوسرے  
مقام پر ان الفاظ میں ملتی ہے:-

وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَ تَنَا وَكُتِرَاءَنَا فَاصْلُوْنَا السَّيْلَا (۳۳)۔

یہ عوام کہیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے اپنے ان مذہبی راہنماؤں اور ارباب اقتدار  
کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے گمراہ کر دیا۔ (سائیدین اور قائم دین میں یہ سب اکابر  
شامل ہو جاتے ہیں)۔

اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی درخواست کریں گے:-

رَبَّنَا آتِنَاهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْتِهِمْ لَعْنَا كَبِيرًا (۳۴)۔

تو انہیں دوسری سزا دے اور انہیں زندگی کی خوشگوار یوں سے اس طرح محروم رکھ کر ان تک کچھ بھی نہ  
پہنچنے پائے۔

دوسری سزا اس لئے کہ ایک تو یہ خود گمراہ ہوئے اور دوسرے انہوں نے ہمیں بھی گمراہ کیا۔

دوسرے مقام پر اس مکالمہ کے ضمن میں کہا ہے: یہ ارباب سیادت و قیادت عوام سے کہیں گے کہ ہم تو تمہیں غلط  
راستے پر چلنے پر مجبور نہیں کیا کرتے تھے تو وہ جواب میں کہیں گے: قَالُوا إِنَّا كُنْهُمْ تَأْتُواَنَا عَنِ الْيَمِينِ (۳۵)  
تم چاروں طرف سے هجوم کر کے ہمیں گھیر لیا کرتے تھے۔ تمہارے پاس بڑے بڑے مؤثر ذرائع اور اسباب تھے  
جن سے تم ہم پر چھا جایا کرتے تھے۔ اس کے بعد تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم ہمیں اپنے راستے پر چلنے کے لئے مجبور  
نہیں کیا کرتے تھے؟ اس کے جواب میں وہ سرغٹے کیا کہیں گے اسے ہم ذرا آگے چل کر بیان کریں گے۔ یہاں اتنا بتا  
دینا کافی ہے کہ عوام کی یہ غدر خواہی بارگاہ خداوندی میں بھی قابل قبول نہیں سمجھی جائے گی۔ عوام اور ان کے یہ سرغٹے  
دونوں جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوں گے:-

عوام ان بڑوں سے کہیں گے کہ ہم تمہارا اعتبار کیا کرتے تھے۔ تم ہمیں بڑے بڑے سبب باغ دکھایا  
کرتے تھے تم کہا کرتے تھے کہ تم بڑی قوت کے مالک ہو۔ تو کیا تم اب ایسا نہیں کر سکتے کہ اس تباہی سے  
بچنے کی کوئی سبیل پیدا کر دو۔ وہ کہیں گے کہ اگر ہمیں اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر آتی تو ہم تمہارے بچاؤ  
کی بھی کوئی شکل بتاتے۔ اب تم چیخو چلاؤ یا اسے خاموشی سے برداشت کر دو۔ اس سے نکلنے کی کوئی



راہ نہیں (۱۱/۱۲) -

اس سے متصل آیت میں ان سرغنوں کو "شیطان" کہہ کر پکارا گیا ہے اور اس کی طرف سے یہ جواب دہرایا گیا ہے کہ جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں اسے اچھی طرح سمجھو۔ ایک بات تم سے خدا نے کہی تھی تو وہ بات حقیقت بن کر تمہارے سامنے آگئی۔ اور ایک بات میں نے تم سے کہی تھی تو واقعہ اس کے خلاف ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس کوئی ایسی قوت نہیں تھی کہ میں تمہیں اپنے پیچھے نہ بردستی لگا لیتا۔ جو کچھ ہوا وہ اتنا ہی ہے کہ میں نے تمہیں آواز دی تو تم نے اس پر فوراً لبیک کہہ دیا اور اس طرح میرے بلاوے کو قبول کر لیا۔ لہذا، تم مجھے الزام مت دو۔ خود اپنے آپ کو الزام دو۔ اب میں بھی چیخ و پکار کرتا ہوں کہ میں گیا، اور تم بھی چیخ و پکار کر رہے ہو کہ تم تباہ ہو گئے۔ سارا معاشرہ کہرام مچا رہا ہے، چھوٹے بڑے سب دہائی سے رہے ہیں لیکن نہ میں ہی تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں نہ تم ہی مجھے بچا سکتے ہو۔ تم نے اس سے پہلے جو یہ روش اختیار کر رکھی تھی کہ میرے قوانین و احکام کی اطاعت، اطاعت قوانین خداوندی کی طرح کیا کرتے تھے۔ میں تمہاری اس روش سے بری الذمہ ہوں۔ تم نے اسے خود ہی اختیار کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی قوانین خداوندی سے سرکشی بریں ان کے لئے الم انگیز تباہی ہوتی ہے۔

إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۱/۱۲)۔

یہاں تو کہا کہ ظالمین کے لئے الم انگیز تباہی ہوتی ہے لیکن دوسری جگہ اس کی وضاحت کر دی کہ غلط روش پر چلنے والے معاشرے پر جب تباہی آتی ہے تو وہ اس خاص گروہ تک محدود نہیں رہتی۔ سارا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آ جایا کرتا ہے۔ اس لئے کہا۔

وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۱۱/۱۳)۔

اس تباہی سے بچنے کی کوئی صورت پیدا کر لو کہ جب وہ آیا کرتی ہے تو ظالمین تک ہی محدود نہیں رہا کرتی۔ پوری کی پوری قوم کو تباہ کر دیا ہے۔ یاد رکھو! غلط نظام کے عواقب بڑے شدید ہوتے ہیں۔ جب ذمے دار ارباب حل و عقد کی بدعنوانیوں کے سبب نہر کا بند ٹوٹتا ہے تو یہ سیلاب چن چن کر انہی لوگوں کے گھروں کا رخ نہیں کرتا جو اس بند کے ٹوٹنے کے ذمہ دار تھے۔ وہ سارے کے سارے گاؤں کو ڈبو دیا کرتا ہے۔ جنگل وہ مسجد اور مندر میں بھی تمیز نہیں کرتا۔



جہنم میں عوام اور ارباب قیادت و سیادت کے مکالمات ہمارے سامنے آ گئے۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ عوام کی غدر خواہی کے دلائل کو بھی قابل قبول نہیں سمجھا گیا۔ لیکن اس کے باوجود اکثر لوگوں کے ذہن میں یہ خیال ابھر کر رہا ہے کہ غلط نظام کے ذمہ دار تو اکابرین قوم ہی ہوتے ہیں۔ عوام بیچارے مجبور ہوتے ہیں۔ اس لئے اکابرین کے ساتھ انہیں بھی جہنم کے عذاب میں کیوں مبتلا کیا جاتا ہے؟ سزا تو انہی کو ملنی چاہیے جو اس غلط روی کے ذمے دار تھے۔ جذباتی طور پر یہ اعتراض کچھ دقیقہ سا نظر آتا ہے لیکن قرآن کریم جذبات سے نہیں حقائق سے



بحث کرتا ہے۔ اس نے اس قسم کے اعتراضات کا جواب ایسے انداز میں دیا ہے جو گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اس سلسلے میں اکابرین نے ان سے کہا تھا کہ بات یہ نہیں کہ ہم یورش کر کے تمہیں ورغلا دیا کرتے تھے، بَلْ لَّكُم مَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۳۱) تمہارا اپنا ایمان کمزور تھا، وَمَا كَان لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ۔ ہمارا تم پر کوئی غلبہ و اختیار نہیں تھا، بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طَآغِيْنَ (۳۲) غلط راستہ پر چلنے کے لئے تمہارا اپنا ہی جی چاہتا تھا۔ (شیطان کے الفاظ میں) تمہاری بے راہ روی میں میرا اتنا ہی حصہ ہے کہ میں نے جب دیکھا کہ تم غلط روش کے لئے پہلے ہی سے مچل رہے ہو تو میں نے تمہیں آواز دی کہ آؤ اکٹھے مل کر لوٹ مار چاہیے۔ تو تم نے اس پر فوراً لبیک کہہ دیا۔ اگر قوانین خداوندی پر تمہارا ایمان محکم ہوتا تو کسی کی کیا مجال تھی کہ تمہیں صحیح راستے سے بہکا دیتا؟ اسی لئے قرآن کریم نے کہا کہ فَإِنَّهُمْ يُؤْمِنُونَ فِي الْغَدَابِ مُشْتَرِكُونَ (۳۳)۔ یہ سب اس سرائیں مشترک ہیں، إِنْ كُنَّا كَذَّابِينَ لَفَعَلْنَا بِالْمُجْرِمِينَ (۳۴) یہ سب یکساں مجرم ہیں اور مجرمین کے ساتھ خدا کا قانون مکافات عمل ایسا ہی ہرناؤ کیا کرتا ہے۔

قرآن کریم نے ان تمام اعتراضات کا جواب ایک ہی فقرہ میں دے دیا کہ عوام کا قصور یہ تھا کہ انہیں خود قوانین خداوندی کی صداقتوں پر ایمان نہیں تھا۔ صاحب ایمان کو دنیا کی کوئی طاقت غلط روش پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اکابرین کے پاس از خود کوئی قوت ہوتی ہی نہیں۔ یہ تو ان عوام ہی کی عطا کردہ ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

ایں خدا تا سجدہ اشکر کردی خداست تا کیے اندر قیام آئی فنا است  
ان خداؤں کی خدائی تو اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک تم ان کے حضور سجدہ ریز رہو۔ تم کھڑے ہو جاؤ تو یہ فنا ہو جائیں گے۔ یہ تو برت کے بت ہیں جو اس وقت تک خدا بنے بیٹھے رہتے ہیں جب تک سورج نہیں نکلتا۔ طلوع آفتاب کے بعد تو یہ خود ہی گپھل کہہ پانی ہو جاتے ہیں۔ شیطان کا غلبہ اس وقت تک ہے جب تک لوگ اس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ اگر یہ اس کی اطاعت نہ کریں تو اسے دنیا میں کوئی پور چھے تک نہیں۔ لہذا، غلط رو اکابرین کے جرائم کی ذمہ داری درحقیقت ان عوام پر عائد ہوتی ہے جو بھیڑ بکریوں کی طرح سر جھکائے ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ : بَلْ لَّكُم مَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۳۵) ان کا صنعت ایمان بلکہ عدم ایمان۔ علامہ اقبالؒ نے اسی قسم کے ننگ انسانیت محکموں کو قوموں کی تباہی کا باعث قرار دیا ہے۔ وہ ایک قطعہ میں کہتے ہیں :-

شنیدم مرگ بانیرداں چنیں گھنت  
چو جان او بگیرم شر مسارم  
چہ بے تم چشم آں گزگل بناید  
دلے اورا ز مردن عار ناید

اور اس کے بعد ہے :-

شباتش وہ کہ میر شمش جہات است  
نگرد و شر مسار از خوارئی مرگ  
بدست او ز مام کا ثبات است  
کہ تا محرم ز ناموس حیات است

(ارمغان حجاز ص ۱۶)



یہ وہ نزع کا عذاب ہے جس میں یہ ساری عمر سسکیاں لیتا رہتا ہے۔ اور اس کے بعد جب وہ مرتا ہے تو قبر اس سے کہتی ہے:

آہ ظالم تو جہاں میں بندہ محکوم تھا؛ میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری نوناگ

تیری میت سے میری تاریکیاں تاریک تر تیری میت زمین کا پردہ ناموس چاک

الحذر! محکوم کی میت سے سو بار الحذر اے سرافیل! اے خدا! اے جان پاک! (ارمغانِ حجاز ۲۳۴)

قرآن کریم کی ساری تعلیم غلامی و محکومی کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — غلامی سے اس کی مراد ہے انسانوں کے احکام و قوانین کی اطاعت، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو اور خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ اور آنادی سے اس کی مراد ہے خدا اور صرف خدا کے قوانین و احکام کی اطاعت جو اس کی کتاب میں مرقوم و محفوظ ہیں۔ اس کے نزدیک انسانوں کی محکومیت شرک ہے اور خدا کی محکومیت توحید۔ قرآن کا یہی وہ بنیادی پیغام ہے جس کی تشریح علامہ اقبالؒ عمر بھر کرتے رہے یہی وہ غلامی ہے جس کے متعلق انہوں نے کہا کہ:

دین و دانش را غلام اذراں دھند تابدن را زندہ دارد، جاں دھند

گرچہ بر لب ہائے او نامِ خداست قبلہ او طاقتِ فرمان رواست (دربورِ عجم)

وہ محکوم اور آزاد کا تقابل ان الفاظ میں کرتے ہیں:

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید آزاد کا دل، زندہ و پُر سوز و طربناک

آباد کی دولتِ دل روشن نفسِ گرم محکوم کا سرمایہ فقط دیدہ مناک

محکوم ہے بیگانہ، احسان و مروت ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

لیکن نہیں محکوم ہو آئاد کا ہمد و شش

وہ بندہ افلاک ہے یہ خواجہ افلاک (ارمغانِ حجاز)

محکوم جب تک اس فریبِ نفس میں مبتلا رہتا ہے کہ — گوشے میں نفس کے مجھے آرام بہت ہے — پیجرے کی نرم و

نازک تیلیاں فولادی سلاخیں بنی رہتی ہیں۔ لیکن جب اس کے دل میں آرزوئے آزادی بیدار ہوتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت

اسے پابندِ نفس نہیں رکھ سکتی۔ وہ ساحرین و ریا و فرعون اور اس کی کابلیہ ایک ممتاز رکنِ مردِ مومن کو مثال کے

طور پر سامنے لاتا ہے (بند و بندہ) یہ بتانے کے لئے کہ

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو تھر تھراتا ہے جہاں چار سُو و رنگ و بو

پاک ہوتا ہے ظن و تخمین سے انسان کا ضمیر کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو

ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش حاکمیت کا بت سنگین دل و آئینہ رو (۱۱)

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ قرآن مجید کیوں محکومی پر رصاصہ مند رہنے والوں کو جہنم کا ایندھن اور اس کے شعلوں کا برابر کا

ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ ان شعلوں کا جن کی تپش دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے (ہلکتی ہے)

والسلام